اداریہ

نائب مدیر

پیغام سیرت

انتظامی ذمے داریاں اور ان کے تقاضے
اسوۂ حسنہ کی روشنی میں

ہم میں سے اکثر کی زندگی کا بڑا حصہ انتظامی ذمے داریوں کی انجام دہی میں صرف ہوتا ہے، کچھ کا اپنے کاروبار کی صورت میں، اور اکثر کا ملازمت کے سلسلے میں۔ ایسے میں بہت سی دقتوں سے ہم روز دوچار ہوتے ہیں، ان دقتوں سے بچنے یا ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے انتظامی طور پر بہت سی تربیتی ہدایات ملتی ہیں، تربیت گاہوں اور تربیتی نشستوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے، مگر یہ سارے سلسلے اب زیادہ تر ایک رسم بن چکے ہیں۔ کسی بھی چیز کے رسم بننے کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ اس کی روح کم زور پڑ گئی ہے۔

پھر دوسری حقیقت یہ بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کو قرآن کریم نے پوری انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ یا رول ماڈل قرار دیا ہے۔(۱) اس بنا پر بھی ہمیں اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں رہ نمائی کا مرکز ذات رسالت مآب ﷺ کو قرار دینا چاہیے۔

جب ہم ذات رسالت مآب ﷺ کو اپنی انتظامی ذمے داریوں کے سلسلے میں بھی رہ نمائی کے لیے مرکز محور قرار دیتے ہیں، تب ہمیں علم ہوتا ہے کہ اس میدان میں بھی اسوۂ حسنہ

۱۔ ملاحظہ ہو الاحزاب: ۲۱

میں آپ ﷺ کس قدر رہ نمائی اور عملی ہدایات موجود ہیں۔

آج کی دنیا میں مینجمنٹ ایک پورا اور بھرپور مضمون ہے، جو اعلیٰ ترین تحقیقی مراتب تک باضابطہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس مضمون کے اپنے تقاضے ہیں۔ ہم یہاں صرف سیرت طیبہ سے اس ضمن میں چند نکات پر اپنی توجہ مرتکز رکھیں گے، جس کے دوران ہماری کوشش ہوگی کہ اس حوالے سے رہ نمائی کے عملی نکات سامنے آسکیں۔ **واللہ ھو الموفق**

مہارتیں حاصل کرتے رہیے

انسان عام طور پر جب تک ملازمت یا کاروبار شروع نہیں کرتا، اس وقت تک سیکھتا رہتا ہے، رسمی تعلیم بھی جاری رکھتا ہے، اور مختصر دورانیے کے مختلف کورسز میں بھی دل چسپی رکھتا ہے، مگر ملازمت شروع ہوتے ہی اس کی صلاحیتوں میں ٹھہراؤ آجاتا ہے، اور وہ ایک مقام پر جا کر رک جاتا ہے۔ یہ عمل درست نہیں۔ بہت سے اداروں میں خصوصی نجی اداروں میں اس مقصد کے لیے مسلسل تربیتی نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے، تربیت کے لیے عملے کو باہر بھی بھیجا جاتا ہے، مقصد فقط یہ ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کسی ایک مقام پر رکنا نہیں چاہیے، اس کے نتیجے میں انسان اور اس کی سوچ منجمد ہوجاتی ہے، اور وہ زیادہ عرصے فعال اور سرگرم کردار ادا نہیں کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کارکردگی متاثر ہونے لگتی ہے، اور اس سے وابستہ امیدیں پوری نہ ہونے کے سبب اس کے متعلق منفی سوچ ادارے میں پروان چڑھنے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ ادارے میں اس کا مقام کم زور پڑتا چلا جاتا ہے۔

اگر یہ صورت حال کسی ایسے شخص کے ساتھ پیش آجائے جو کسی بھی انتظامی عہدے پر فائز ہے تو یہ بات مزید خطرناک ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں اپنے ماتحتوں سے کام لینا بھی مشکل ہوجاتا ہے، بعض صورتوں میں تو ممکن بھی نہیں رہتا۔ اس کا حل یہی ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو مسلسل بہتر کیا جائے، اور ہر ضرورت کی تکمیل کے لیے انسان ہمہ وقت تیار رہے۔

رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں اس حوالے سے بھی ہدایات موجود ہیں۔ خصوصاً آپ ﷺ نے ہمیشہ نئی دریافتوں اور مہارتوں کی حوصلہ افزائی کی، اور نئی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے صحابۂ کرام کو تیار فرماتے رہے۔ اپنے کاتب خاص حضرت زید بن ثابت رضی

اللہ عنہ سے ایک روز آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سریانی زبان سیکھ لو۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں یہودی خط سریانی سیکھ لوں۔ نصف مہینہ نہیں گزرا کہ میں نے وہ خط سیکھ لیا۔ اس کے علاوہ وہ فارسی حبشی، قبطی (مصری) خط پڑھنا جانتے تھے۔ (۱)

یہ ایک مثال ہے، ایسی کئی ایک واقعات سیرت کے صفحات سے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

نرمی سے کام لیجیے

نرمی کو مزاج کا حصہ بنانا لازم ہے، اس طرح کہ شخصیت ہی ملائم نظر آئے، مگر اس کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ احکامات ہی نہ دیے جاسکیں، یا اپنی بات ہی نہ منوائی جاسکے۔ نرمی مزاج کا نام ہے، یہ مزاج رفتہ رفتہ پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نرمی کے فوائد پر کیا بات کی جائے، سب ہی جانتے ہیں، مگر انتظامی امور سے اس صفت سے کم کم ہی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

نرمی دراصل حکمت عملی ہے۔ کسی بھی بڑے قدم سے پہلے غور وفکر ضروری ہوتا ہے، اس مقصد کے لیے وقت درکار ہوتا ہے، مگر بعض صورتوں میں فوری فیصلہ ضروری ہوجاتا ہے، ایسے میں نرمی کو حکمت عملی بنا کر اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ فوری اشتعال، فوری ردعمل، فوری مطالبہ، فوری نگہ داشت، فوری مدد، ایسے ہر مطالبے کا حل نرمی ہے جو تیز سے تیز ماحول میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کا آزمودہ نسخہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے نرمی کو انسانی صفات میں سب سے نمایاں صفت قرار دیا ہے۔ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

من یحرم الرفق یحرم الخیر (۲)

جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔

اور دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی اور رفق کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرمی اور نرم دلی پر بیش بہا انعامات فرماتے ہیں۔ فرمایا:

۱۔ عقد الفرید لابن عبد ربہ

۲۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۲۔ رقم ۲۵۹۲

ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف وما لا یعطی علی ماسواہ (۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر انسان کو وہ کچھ عطا کرتا ہے جو وہ نہ تو سختی پر عطا کرتا ہے نہ اس کے سوا کسی اور چیز پر۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بہت سے ایسے واقعات ہوئے جب نرم خوئی اور رحم دلی کے مظاہرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آئے، اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل حیات طیبہ میں ان صفات کا عکس نظر آتا ہے، لیکن بعض مواقع پر آپ ﷺ کی یہ صفات خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے روایتی جارحانہ اور مخالفانہ انداز میں آں حضرت ﷺ کو سلام کرتے ہوئے انہوں نے کہا: السام علیکم! عربی میں سام کے معنی موت کے آتے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی اس موقع پر موجود تھیں، انہوں نے یہودیوں کی اس واضح اشتعال انگیزی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا:

وعلیکم السام والذم

تم پر موت آئے اور لعنت ہو۔

ہر چند کہ اس اشتعال انگیزی کی ابتدا یہود کی جانب سے ہوئی تھی، مگر ان کے جواب میں بھی یہ جملہ کہنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

یاعائشۃ، لاتکونی فاحشۃ

اے عائشہ بے ہودہ گوئی کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

یاعائشۃ ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ

عائشہ! اللہ تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔

۱۔ مسلم: ج ۴ ص ۱۸۲۔ رقم ۲۵۹۳

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

الم تسمع ما قالوا؟

یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) انہوں نے جو کچھ کہا، کیا آپ نے نہیں سنا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بلی قد سمعت، فرددت علیھم[1]

میں نے ضرور سنا اور اس کا جواب بھی دے دیا کہ ''علیکم'' تم پر ہو۔

یعنی صرف اسی قدر کہنا جب کافی تھا تو مکمل جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

تنقید نہیں اصلاح

دفتر کا ماحول مسلسل اور بار بار کی تنقید سے بھی متاثر ہوتا ہے، اس کے دو بڑے نقصانات ہیں:

الف: لوگوں کے مزاج تنقید سننے کے عادی ہوجاتے ہیں، پھر ان پر تنقید اثر ہی نہیں کرتی۔ عام لفظوں میں کہیے تو وہ ڈھیٹ بن جاتے ہیں۔

ب: ان میں منفی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں، جو مخالفت برائے مخالفت کے ماحول کا سبب بنتے ہیں۔

اس لیے یہ مسئلے کا حل نہیں۔ تنقید ضروری ہے۔ ہر کام نہ درست ہوتا ہے، نہ پسند کیے جانے کے قابل، پھر کیا اسے برداشت کرلیا جائے؟ یہ بھی درست عمل نہیں۔ اس کی وجہ سے نہ دفتر کا کام درست ہوگا، نہ کام کرنے والا سیکھ ہی سکے گا۔ پھر کیا کیا جائے؟ تنقید کو اصلاح کے عمل سے بدل دیجیے۔ اصلاح اور تنقید میں فرق صرف یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ ایسے لہجے میں کہی جائے کہ ناگواری پیدا نہ ہو، اور وہ بات سمجھانے کی نیت سے کہی جائے۔ اس میں طعن کا، جتانے اور شرمندہ کرنے کا پہلو نہ ہو۔ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ علیحدگی میں خاموشی کے ساتھ کام اپنے ہاتھ سے درست کر کے دکھا دیا جائے۔ (اگر ایسا کرنا ممکن ہو) ورنہ درست کام کیسے ہوتا ہے، وہ کسی بھی معقول طریقے سے باور کرا دیا جائے۔ شرمندہ کرنا، طعنے دینا، سرعام

۱۔ مسلم: ج ۳، ص ۱۳ ۴ ۔ رقم ۲۱۶۵، ۲۱۶۶، ۲۱۶۷

غلطی کا ذکر کرنا، یا اٹھتے بیٹھتے غلطیاں جتانا مسئلے کا حل نہیں، نہ اس سے نفرت کے سوا کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا طرز عمل ملاحظہ کیجیے، انس بن مالک ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ہم مسجد نبوی میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک ایک دیہاتی آیا اور مسجد میں ہی پیشاب کرنے لگا، صحابہ اسے روکنے کو دوڑے، رسول اکرم ﷺ نے انہیں روک دیا اور فرمایا کرنے دو۔ غور فرمایے، مسجد نبوی ہے، نبی مکرم ﷺ بہ نفس نفیس موجود ہیں۔ ایک شخص جو اجنبی مسافر ہے، انجانے میں ایک ایسا کام کر گزرتا ہے، جو مسجد نبوی کے شایان تو کجا کسی عام عوامی مقام کے بھی شایان نہیں، اور جس کا تصور ہی کراہت کا باعث ہے، مگر آپ ﷺ کا رویہ کیسا ہے؟ الٹا اس عمل سے گزرنے دیتے ہیں جب وہ فراغت پالیتا ہے تب اسے بلا کر سمجھا دیتے ہیں کہ مساجد ایسی گندے کاموں کے لیے نہیں بنائی جاتیں۔ یہ مساجد تو نماز کے لیے، ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ پھر آپ نے ایک ڈول پانی منگا کر اس پر بہا دیا۔(۱)

دیکھیے اتنا بڑا واقعہ، مگر نہ کوئی ایشو بنا، نہ ردِ عمل کی فضا قائم ہوئی، نہ کسی نوعیت کی بدمزگی پیدا ہوئی، نہ کسی بھی جانب کوئی غلط فہمی ہی پیدا ہوسکی، نہ کسی کو برا ہی محسوس ہوا، اور مقصد حاصل کرلیا گیا۔ غلطی کرنے والے کو ہمیشہ کے لیے سبق بھی حاصل ہوگیا، یہ اصلاح ہے، اور یہی عمل ہمارے لیے رہ نما ہے۔

غور سے سنیے

ہم اپنی نشست پر بیٹھ کر صرف حکم دینے اور نتائج حاصل کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ پھر ہم سننے سے عاری ہوتے چلے جاتے ہیں۔ صرف حکم دینا اور کسی کی نہ سننا سخت نقصان کا باعث ہے۔ یہ بات بڑھتے بڑھتے نفسیاتی عارضے کی شکل میں اختیار کرلیتی ہے۔ یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ کسی کی نہ سننے والا شخص بڑے نقصانات سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً:

الف: وہ تازہ ترین حالات سے آگہی حاصل نہیں کرسکتا، اسے اندازہ ہی نہیں ہو پاتا

۱۔ مسلم: ج ۱، ص ۱۹۷، رقم ۲۰۰ (۲۸۵)

کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں، حالات کس رخ پر جارہے ہیں، اور دفتر سے باہر کیا ہورہا ہے۔

ب: وہ مشاورت سے محروم ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے سامنے کسی بھی حوالے سے دوسری رائے سامنے نہیں آپاتی۔ اس کی معلومات اور اس کا وژن دونوں ادھورے رہ جاتے ہیں۔

ج: ایسا شخص لوگوں کا اعتماد نہیں حاصل کرپاتا۔

د: دوسرے افراد اس کے بارے میں عدم اعتماد اور اس کی بنا پر بددلی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ھ: اس کے نتیجے میں طرح طرح کی افواہیں جنم لیتی ہیں، اور ایک خاموش محاذ آرائی یا سرد جنگ اداروں کی اندرونی سیاست میں نچلی سطح پر جنم لینے لگتی ہے۔

یہ تمام امور بعد میں آگے چل کر ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے بچنے اور محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ سننا اور مسلسل سننا۔

سننا حضور اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ ایک بار نہیں درجنوں بار ایسا ہوا کہ آپ نے اہتمام سے فریق مقابل کی بات سنی، اور جب تک وہ خاموش نہیں ہوا آپ مسلسل صبر وسکون اور خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔ مقابل کی گفت گو ختم ہونے پر آپ ﷺ نے اپنی بات فرمائی۔ ایک بار معروف اور معزز سردارِ مکہ ابوالولید عتبہ بن ربیعہ کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اس نے آکر بڑے سلیقے سے بات شروع کی، مگر اس کا موقف کسی کو بھی غصہ دلادینے کے لیے کافی تھا، اس نے کہا کہ ''اے محمد ﷺ آپ ﷺ کی شرافت نسبی اور مرتبے میں کسی کو کلام نہیں، لیکن آپ ﷺ نے ایک اتنی بڑی بات کی ہے، جس سے قوم دو ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ آپ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں، ہمارے آبا واجداد کو احمق اور نادان بتاتے ہیں آپ ﷺ نے ہمیں عرب میں رسوا کردیا ہے، اب وہ کہتے ہیں کہ قریش میں بھی ساحر و کاہن موجود ہیں، میں اس بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، آپ ﷺ میری بات توجہ سے سنیں جو امور میں آپ ﷺ کے سامنے رکھوں گا اگر ان میں سے کوئی بات آپ نے قبول کرلی تو یہ جھگڑا ختم ہوجائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوالولید کہو میں سنتا ہوں۔

عتبہ نے کہا۔ ''اے میرے بھتیجے، نبوت کے دعوت سے اگر آپ ﷺ کا منشا مال و

دولت جمع کرنا ہے تو ہم سب مل کر آپ ﷺ کے لیے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی آپ کے مقابل نہیں آسکے گا، اگر آپ ﷺ شرف وسرداری چاہتے ہیں تو ہم آپ ﷺ کو اپنا سردار تسلیم کرلیں گے، کوئی شخص آپ ﷺ کی مرضی کے خلاف کام نہیں کرے گا، اگر آپ کی غرض بادشاہ بننا ہے تو ہم آپ کو بادشاہ مقرر کرلیں گے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر آپ ﷺ شادی کرنا چاہتے ہیں تو جس عورت سے یا جتنی عورتوں سے آپ چاہیں گے ہم شادی کر دیں گے۔ اگر آپ ﷺ کو ان میں سے کسی کامل طبیب کو بلا کر آپ کا علاج کرائیں گے، تاکہ آپ ﷺ کو صحت ہوجائے، بعض اوقات بیماریاں سمجھ میں نہیں آتیں مگر کسی کامل طبیب سے علاج کرانے پر صحت ہوجاتی ہے۔ عتبہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہوگیا تو آں حضرت ﷺ نے دریافت فرمایا۔ اے ابوالولید کیا تم کہہ چکے جو کہنا چاہتے تھے۔ ابوالولید نے کا کہ ہاں میں کہہ چکا۔ پھر آپ ﷺ نے سورۂ حم سجدہ کی ۳۸ آیتیں، آیت ۱ تا ۳۸ تلاوت فرمائیں۔(۱)

دیکھیے آپ ﷺ نے عتبہ کی گفت گو کس اہتمام سے سماعت فرمائی، اور نہایت خاموشی سے سننے کے بعد اس کے خاموش ہونے پر اپنا نظریہ قرآن کے الفاظ میں پیش فرمایا۔ نہایت صبر وتحمل کے ساتھ اس حسنِ سماعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عتبہ جب واپس لوٹا تو وہ آپ سے اس حد تک متاثر ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ کی صحبت کا اثر اور آپ کے موقف کا تاثر اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ چناں چہ ابوجہل نے جب اسے دیکھا تو دیکھتے ہی بول اٹھا کہ یہ عتبہ تو وہ نظر نہیں آتا۔ یہ تو بے دین ہوگیا ہے۔

عتبہ نے کہا کہ میں نے ان کا کلام سنا ہے خدا کی قسم میں نے ایسا کلام اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ واللہ نہ وہ شعر ہے اور نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ خدا کی قسم یہ کلام اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عن قریب اس کی ایک شان ہوگی۔ اے قریش کے لوگو! تم میرا کہا مانو۔ تم محمد ﷺ کے پیچھے نہ پڑو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ شخص غالب آگیا تو اس کا غلبہ تمہارا غلبہ ہے

۱۔ ابن اسحاق: ص ۲۴۲، ۲۳۴۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۵۔ البدایہ والنہایہ: ج ۳، ص ۸۱۔ حلبی: ج ۱، ص ۴۸۶۔۴۸۹

اور اس کی عزت تمہاری عزت ہے اور اس کی حکومت تمہاری حکومت ہے، اس لیے کہ وہ تمہاری ہی قوم میں سے ہے۔ اور اگر وہ مغلوب ہوا تو تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا، تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ قریش نے کہا اے ابوالولید اس شخص نے تمہیں اپنے کلام سے مسحور کر دیا۔ عتبہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنی رائے ظاہری کر دی اب تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ (۱)

مسکراہٹ

انتظامی معاملات میں انسان کا رویہ سب سے اہم ہے، انسانی مزاج بھی یہی ہے کہ وہ سخت بات سے اس قدر متاثر نہیں ہوتا، جس قدر سخت لہجے سے متاثر ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے بیوروکریسی کے رویوں کو انتظامی مناصب کی ضرورت تصور کر لیا ہے، اور اس کے لازمی تقاضے کے طور پر ہم کوشش کرتے ہیں کہ جب بھی کسی منصب پر بیٹھیں تو چہرے پر خشونت اور لہجے میں یبوست سمو کر بیٹھیں۔ یہ بات جہاں ایک جانب انتظامی طور پر دقتوں کا باعث بنتی ہے، وہیں اس کے سبب ہم وہ نتائج بھی حاصل نہیں کر سکتے، جو عام انسانی رویے کی بنیاد پر ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں علم ہوگا کہ خالص انتظامی مواقع پر بھی ہمیں رسول اکرم ﷺ مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت آپ ﷺ کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ آپ ﷺ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے زیادہ مسکرانے والا کوئی نہیں دیکھا۔ (۲) یہ بات کہنا اور غور کیے بغیر پڑھ لینا بہت آسان ہے، مگر غور کیجیے کہ آپ ﷺ کی خاص تیئس برس کی ہر طرح کی ہنگامہ خیزیوں سے بھرپور زندگی میں، اس قدر مصائب، مشکلات، چیلنجز، مسائل اور نت نئے محاذوں کے درمیان آپ کس طرح مسکرا لیتے تھے، تب ہی اس مختصر سے جملے کے وزن کا ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک دن نبی ﷺ کسی کام سے جا رہے تھے۔ آپ کے خادم انس بن مالکؓ بھی

۱۔ ابن اسحاق: ص ۲۴۲، ۲۳۴۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۵۔ البدایہ والنہایہ: ج ۳، ص ۸۱۔ حلبی: ج ۱، ص ۴۸۶۔۴۸۹

۲۔ ترمذی الشمائل: ۲۲۶، ص ۳۹۷۔ ص ۳۹۹

آپ کے ہم راہ تھے۔ آپ ﷺ نے اس وقت موٹے کناروں والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ایک دیہاتی آیا اور آپ ﷺ کی چادر کا پلو اس نے پکڑ لیا، اور آپ کی چادر کو اس نے ایک جھٹکے سے کھینچا۔ انسؓ کہتے ہیں کہ اس نے چادر اس شدت سے کھینچی کی نبی ﷺ کی گردن پر نشان پڑ گیا۔

پھر وہ نہایت سخت لہجے میں بولا: اے محمد! تمہارے پاس جو اللہ کا مال ہے، اس میں سے مجھے بھی کچھ دو۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ پھر صحابہ کو حکم دیا کہ اسے کچھ دیا جائے۔ (۱)

اسی طرح ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو، غزوۂ خیبر کا واقعہ ہے، لڑائی کے دوران چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کچھ چربی تھی اور گھی سے بھری ایک مشک یہود کے قلعے کی فصیل سے نیچے آ گری۔ عبداللہ بن مغفلؓ نے انہیں اٹھالیا اور اپنے خیمے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں انہیں ایک شخص ملا جو مالِ غنیمت جمع کرنے اور اسے ترتیب دینے پر مامور تھا۔ اس نے تھیلا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا کہ لاؤ اسے میرے حوالے کرو۔ میں اسے مسلمانوں میں تقسیم کروں گا۔ عبداللہ نے کہا کہ نہیں، اللہ کی قسم! یہ میں تمہیں نہیں دوں گا۔ یہ مجھے ملا ہے۔

اس نے کہا کہ اس سے انکار کس کو ہے کہ یہ تمہیں ملا ہے، مگر یہ امانت ہے۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے یہ ماجرا دیکھا تو مسکرائے، پھر اس شخص سے کہا کہ عبداللہ اور تھیلے کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔

اس پر اس شخص نے عبداللہ کو چھوڑ دیا۔ عبداللہ اسے لے کر خیمے میں اپنے ساتھیوں کے پاس آ گئے، پھر سب نے مل کر اس میں موجود چربی پکا کر اس سے اپنی بھوک مٹانے کا سامان کیا۔ (۲)

یہی سبب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض مسکرا دینے کو بھی صدقہ قرار دیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

۱۔ بخاری: رقم ۳۱۴۹

۲ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ: ج ۳، ص ۳۵۴

تبسمک فی وجہ اخیک لک صدقۃ (۱)

تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔

قسمت پر راضی رہیے

انتظامی معاملات میں کسی صاحب اختیار منصب پر فائز ہونے کے باوجود انسان کی کارکردگی اس وقت شدید متاثر ہوجاتی ہے، جب اسے بھرپور پذیرائی نہیں ملتی یا متوقع ترقی بروقت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ ایک انتظامی دقت ہے۔ مگر اس کا ایک ہی حل ہے، قناعت کا جذبہ اور اپنی قسمت پر شاکر رہنے کی عادت۔ شکر ایک غیر معمولی وصف ہے، جس کے نتیجے میں انسان بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے، ان میں سرفہرست ناشکری اور اس کے لازمی مسائل ہیں، ان میں حسد، بغض، کینہ شامل ہے۔ ان عوارض میں مبتلا ہونے کے بعد انسان چڑچڑا ہوجاتا ہے، یک رخا ہونے کے سبب اس میں درست تجزیے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، اور رفتہ رفتہ دفتری زندگی کے ساتھ ساتھ احباب کے ساتھ روابط اور گھریلو زندگی تک شدید بحران کا شکار ہوجاتی ہے۔ اس کا حل پیش کیا جاچکا، قناعت اور صرف قناعت۔

انسان کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ دنیا میں ملنے والا منصب، دولت، شہرت اور عزت میں سے کوئی چیز بھی اس کی قابلیت اور صلاحیت کے سبب اسے حاصل نہیں ہوئی، ورنہ ہمارے اطراف میں بھی کس قدر لوگ موجود ہیں، جو سب کچھ رکھنے کے باوجود آج ہم سے کم منصب کی ملازمت کرنے پر مجبور ہیں۔ صلاحیت اللہ کی عطا کا بدل نہیں ہوسکتی، جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ خود صلاحیت بھی رب کی عطا اور اس کی دین ہے۔

یہ کام مشکل ضرور ہے، مگر اس بات کو سمجھنے کے لیے انسان اگر یہ تصور کرلے کہ کسی کو اللہ نے دولت سے نوازا ہے، کسی کے پاس عقل ہے، کسی کے پاس خاندان اور اس کا ممتاز پس منظر ہے، کسی کو اس نے قابل رشک صحت عطا کی ہے، کسی کو غیر معمولی فہم وفراست دی گئی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے، سب چیزیں کسی ایک میں یک جا نظر آئیں، اور ان سے ہر چیز اپنے عروج رہو، اس دنیا میں کم از کم یہ ممکن نہیں۔ اس غور وفکر کے نتیجے میں انسان میں صبر وشکر کی صفات بہ

۱۔ الترمذی: رقم ۱۹۵۶

یک وقت پروان چڑھتی ہیں، اور انسان ان کم زوریوں سے محفوظ رہتا ہے، جو اس کے لیے مزید مشکلات کا باعث بن جاتی ہیں، جن میں انتظامی امور بھی شامل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اسلام لایا اور اسے گزارے کے مطابق روزی میسر آ گئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی دی ہوئی روزی پر قناعت کی توفیق بخشی تو وہ فلاح و کام رانی سے ہم کنار ہوا۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے میرا شانہ پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ دنیا میں اس طرح بن جاؤ جیسے تم مسافر یا راستے پر چلنے والے ہو۔ شام ہو جائے تو صبح کے منتظر نہ رہو اور صبح کے وقت شام کے منتظر نہ رہو (بل کہ جو نیک عمل کرنا ہے اسی وقت کر لو) اور اپنی صحت کو مرض سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت جانو۔ (۲)

یہ احکامات ہمارے پیش نظر رہیں تو ہم اپنی قسمت پر شاکر و صابر رہنے کا ہنر سیکھ سکتے ہیں، اور قناعت کے جوہر سے اپنے آپ کو آراستہ کر سکتے ہیں۔

اپنی خیر خواہی باور کرائیے

رسول اکرم ﷺ نے پوری امت کے لیے ہمیں خیر خواہی کا حکم دیا ہے، حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے ایک بار فرمایا:

الدین النصیحة

دین تو خیر خواہی کا نام ہے۔

صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ کس کی خیر خواہی؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

للہ ولکتبہ ولرسولہ ولائمة المسلمین وعامتھم (۳)

اللہ کی، اس کی کتب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے حاکموں کی اور عام مسلمانوں کی۔

۱۔ مسلم: ج ۲، ص ۱۱۳، ۱۰۵۴۔ ترمذی: ج ۴، ص ۱۵۶، رقم ۲۳۵۵

۲۔ بخاری: ج ۴، ص ۱۹۰، رقم ۶۴۱۶

۳۔ مسلم، ایمان، بیان ان الدین النصیحۃ: رقم ۵۵

ہم دردی اور خیر خواہی کی صفات اسلام کے مسلمہ اخلاقی تعلیمات میں سے ہیں، اس کا خلاصہ مختصر ترین الفاظ میں وہی ہے، جو نبیٔ رحمت ﷺ نے الدین النصیحۃ کے ذریعے بیان فرمایا کہ پورا دین اسلام ہی خیر خواہی کا نام ہے، اپنی خیر خواہی، اپنے متعلقین کی خیر خواہی، اپنے حکم رانوں اور ماتحتوں کی خیر خواہی، پھر دین اسلام کی، اس کے شعائر و علامات اور متعلقات کی خیر خواہی اور پھر عامۃ الناس کی، اللہ کی ساری مخلوق کی خیر خواہی۔ اسلامی تعلیمات کا یہی تو خلاصہ ہے، ان ہی پر عمل پیرا ہونے کی اسلام تلقین کرتا ہے، اور ہماری دنیاوی واخروی ہر طرح کی فلاح وکام یابی بھی ان ہی پر عمل پیدا ہونے میں منحصر ہے۔(۱)

خیر خواہی انتظامی معاملات میں بھی ضروری ہے کہ مگر اس کے نتائج مختلف ہو سکتے ہیں، انہیں درست انداز میں لے کر چلنا اور مرتب کرنا ہی اصل ذمے داری اور اس ذمے داری سے عہدہ برا ہونا ہی اصل کام یابی ہے۔ مثلاً ہم کسی بھی منصب پر اپنے کسی ماتحت کے لیے ایک فیصلہ کرتے ہیں، جو ہماری دانست میں اس کے مستقبل کے حوالے سے درست ہے، مگر اسے وہ پسند نہیں آتا، اب وہ اس پر ردعمل دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا بھڑک جانا فطری ہے، کسی سے بھرپور خیر خواہی کے بعد برعکس ردعمل کا سامنا کرنا آسان کام نہیں۔ ایسی صورت میں زیادہ درست عمل یہ ہوگا کہ ہم اس کے سامنے ساری صوت حال رکھتے ہوئے، اپنی خیر خواہی ثابت کریں، تاکہ غلط فہمی پیدا ہونے سے قبل ہی ختم ہو سکے۔

اسوۂ رسول ﷺ ملاحظہ کیجیے، ایک روز آپ نے نماز جلدی پڑھادی۔ سلام پھیرا تو صحابۂ کرام کو حیران دیکھ کر فرمایا:

> شاید آپ کو تعجب ہوا کہ میں نے نماز جلدی پڑھادی۔ دراصل میں نے ایک بچے کے رونے کی آواز سنی تو مجھے اس کی ماں پر رحم آ گیا۔(۲)

یہاں عام تاثر یہ پیدا ہو رہا تھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے نماز کو مختصر اپنی کسی ضرورت کے تحت کیا ہے، مگر آپ نے فوری وضاحت فرمادی کہ یہ عمل محض خیر خواہی کے جذبے کے تحت

۱۔ درس سیرت، ص ۱۰۳

۲۔ بخاری: رقم ۷۰۷۔ مسلم: ۴۷۰۔ ترمذی: ۳۷۶

کیا گیا ہے، اور اس کی مصلحت یہ تھی کہ بچے کا رونا اس کی ماں پر یقیناً شاق گزر رہا تھا۔

برائی کا بدلہ

دنیا میں موجود اللہ کا نظام یہی کہا ہے کہ انسان برے اعمال کرے گا تو اسے آخرت میں برے انجام سے دو چار ہونا پڑے گا، اور اس برائی کے اثرات دنیا میں بھی سامنے آسکتے ہیں، مگر یہ مجموعی زندگی کا معاملہ ہے، اور اللہ کا اختیار ہے، بندے کو ہر صورت میں خیر خواہی کرنے اور معاف کرنے کا ہی حکم ہے، قرآن کریم میں فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ (۱)

اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔ آپ (برائی کو) بھلائی سے دور کیجیے۔ اس سے آپ کا دشمن دلی دوست کی مانند ہو جائے گا۔

انتظامی امور میں انسان کو بعض اوقات سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اس موقع پر کسی بھی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے غور کرنا چاہیے کہ اس موقع پر کیا فیصلہ بہتر ہے، درگزر کرنا، یا سزا دینا۔ نیز اگر سزا دینا ہی ناگزیر ہو جائے تب بھی اسے ''بدلہ'' بننے سے بچانا ہوگا، یعنی یہ تاثر پیدا نہ ہونے پائے کہ یہ کسی بات کا بدلہ لیا جا رہا ہے، بل کہ یہ باور کرایا جائے کہ یہ ایک تادیبی کارروائی ہے جو انتظامی ضرورتوں کے تحت ناگزیر ہو گئی تھی، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سارا نظام تاثر ہوتا اور دوسرے افراد پر منفی تاثر پیدا ہوتا۔ اس حد تک جانے سے قبل درگزر کرنا ہی اچھا بدلہ ہوتا ہے۔ یہ اصل میں ایک خاموش پیغام ہوتا ہے، جو عام طور پر جلد یا بہ دیر اثرات ضرور چھوڑتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ دیکھیے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اصحاب کرام کی مبارک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک دیہاتی شخص آیا جو دیت کی ادائیگی میں مدد کا طالب تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے کچھ مال دیا اور پوچھا کہ کیا میں نے تم سے اچھائی کی؟ اس نے کہا: نہیں، تم نے کوئی اچھائی نہیں کی۔ یہ سن کر صحابۂ کرام کو غصہ آیا اور ظاہر ہے کہ آنا بھی چاہیے

۱۔ حم السجدہ: ۳۴

تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگے تو آپ ﷺ نے روک دیا، پھر آپ گھر گئے اور اعرابی کو بھی وہیں بلا لیا۔ آپ نے اس سے کہا: تم ہمارے پاس آئے۔ ہم سے مدد طلب کی۔ ہم نے تمہیں کچھ نہ کچھ دیا، جب کہ تم نے جو کہا سو کہا: یہ کہہ کر آپ نے اسے کچھ اور پیسے دیے، پھر دریافت کیا: میں نے تم سے اچھائی کی؟ وہ دیہاتی بولا:

ہاں! اللہ تمہیں اہل وعیال کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔

آپ کو اس کے اطمینان سے خوشی ہوئی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: تم ہمارے پاس آئے۔ ہم نے تمہیں کچھ نہ کچھ دیا۔ تم نے جو کہا سو کہا۔ اب میرے ساتھی تم سے ناراض ہیں۔ ان کے پاس جا کر شکریے کے الفاظ کہو جو مجھ سے کہے ہیں تاکہ ان کے دل تمہارے طرف سے صاف ہو جائیں۔

پھر وہ دیہاتی آیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: آپ کا ساتھی ہم سے مدد کا طالب تھا۔ ہم نے اسے پیسے دیے۔ اس نے جو کہنا تھا کہ دیا۔ ہم نے اسے پھر بلایا اور کچھ اور پیسے دیے تو یہ راضی ہو گیا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا: ''کیوں، ٹھیک ہے نا؟'' اس نے کہا:

ہاں، بالکل ٹھیک، اللہ آپ کو اہل وعیال اور خاندان کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔

اعرابی رخصت ہونے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اس اعرابی کی اور میری مثال یوں ہے کہ ایک آدمی کی اونٹنی بدک گئی۔ لوگ اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ انہیں دیکھ کر اور تیز بھاگی۔ صاحب ناقہ نے کہا: ''میرے اور میری اونٹنی کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں اس سے نرمی برتوں گا۔ مجھے اس کے مزاج سے واقفیت ہے۔ وہ گیا، کچھ گھاس پھونس جمع کی اور اونٹنی کو بلایا۔ اونٹنی دوڑی آئی۔ اس نے اونٹنی پر پالان باندھا اور اطمینان سے اُس پر بیٹھ کر چل دیا۔ اس دیہاتی نے جو تلخ کلامی کی اُس پر میں آپ لوگوں کی بات مانتا تو وہ

آگ میں جاتا۔(۱)

یعنی وہ بے ادبی کے سبب کفر کے دائرے تک پہنچ سکتا تھا اس لیے ایسی فضا پیدا کرنا ضروری تھی کہ وہ بھی ردِعمل کا شکار نہ ہو، اور اس کے سامنے بھی کوئی ردعمل نہ دیا جائے۔

دوسروں کے کام آیئے

خود پسند اور اپنی ذات میں مگن شخص کسی بھی معاشرتی ذمے داری کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا۔ انسانی ماحول میں اٹھنے بیٹھنے والے کو ایثار پیشہ ہونا پڑتا ہے۔ یہ ماحول کا تقاضا اور معاشرت کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اور حیات طیبہ کے پورے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواہ اپنا کام ہو یا کسی اور کی کوئی خدمت، جب بھی کبھی ایسا کوئی موقع سامنے آتا تو آپ ﷺ اس کی ادائیگی کے لیے دوسروں سے پہلے کھڑے ہوتے اور نہ صرف یہ کہ اپنے صحابۂ کرام کے ساتھ اپنے لیے کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے لیے ترجیحی بنیادوں پر کسی سلوک کے خواہش مند نہیں ہوتے تھے، بل کہ اس طرح کے ہر کام میں دوسروں سے بھی سبقت لے جاتے تھے۔ یہ صفت یقیناً انسانیت کی معراج ہے اور آپ ﷺ اکمل الخلق اور احسن الخلق ہونے کی وجہ سے اس معراج کی بھی آخری بلندی پر فائز تھے، لیکن آپ ﷺ کے عطا فرمودہ اسوۂ حسنہ اور راہ عمل نے ہمیں بھی اس عمل کی تحریک بخشی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ دوسری اور بہت سی اچھی صفات کی مانند اس صفت سے بھی ہم دور ہوتے جارہے ہیں۔

اس کی سب سے اہم وجہ ہمارا افسرانہ کلچر ہے، جس میں خود اٹھ کر پانی پینا تو کجا، سامنے میز پر رکھے ہوئے گلاس کو اپنے ہاتھوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ہونٹوں تک لانا بھی خلافِ شان تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اندازِ زیست اصحابِ اختیار اور صاحبانِ منصب سے منتقل ہوکر کلرکوں تک پہنچتا ہے، اور یہ کلاس جب اپنا آئیڈیل عملی طور پر کہیں نہیں پاتی تو گھر میں بادشاہی کے مزے لوٹتی ہے، اور اب دیکھا دیکھی یہ شان ہر طبقے کی کم زوری بن چکی ہے۔ نتیجتاً

۱۔ البحر الزخار: ج ۱۵، ۲۹۴، رقم ۸۷۹۹

کوئی شخص بھی (الا ماشاء اللہ) انہیں حدود اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں اس وقت تک کچھ کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا، جب تک کہ اس کے سر پر نہ آپڑے اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی نہ رہ جائے۔

یہ صورتِ حالات تو اپنے کام کے بارے میں ہے، رہا دوسروں کے کام آنا، تو اس کا تو تصور بھی امرِ محال ہے۔ بلاضرورت اور بے لوث طریقے سے دوسروں کے کام آنے کا تخیل بھی عنقا ہو چکا ہے، اور کبھی کہیں کوئی ایسا موقع آجائے تو سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے کہ ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ یہ سوداگرانہ ذہنیت ہماری ایک نہیں کئی ایک برائیوں کی جڑ ہے۔

خصوصیت کے ساتھ ہمارا مقتدر طبقہ جس میں حکم ران، اہل ثروت، عمائدین، معززین اور سیاسی شخصیات بھی شامل ہیں، اہل طریقت بھی اور اہل شریعت بھی، یہ سب اگر یہ فیصلہ کرلیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے، آج سے دن میں صرف ایک بار بے لوث طریقے سے کسی کے کام آئیں گے اور پھر اپنے اس نیک عمل کو اپنے ذہن سے مٹادیں گے تو شاید چند ہی روز میں دوسروں کی شکایتیں کرنے والے خود ان کی شان میں رطب اللسان ہو جائیں۔(۱)

اس مزاج کا سب سے اہم نقصان یہ ہے کہ انسان اپنے عمل سے ماحول میں دوریاں پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اپنا کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کام آنے سے ماحول میں پہلے سے موجود تناؤ بھی کم ہو جاتا ہے، اور اپنائیت پورے ماحول کا احاطہ کرلیتی ہے۔ یہ کیفیت انتظامی طور پر جس قدر مفید ہوسکتی ہے، اس کا تصور آسان ہے۔ یہ پوری سیرت طیبہ اس حوالے سے ہمیں رہ نما خطوط عطا کرتی ہے۔

حبشہ سے رسول اللہ ﷺ کے پاس جو مہمان آتے تھے آپ ہمیشہ ان کی خود خدمت کرتے تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش ہوتی کہ یہ کارِ خیر ہم انجام دیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ان کی خدمت میں خود کروں گا۔ کیوں کہ انہوں نے میرے دوستوں کی

۱۔ سید عزیز الرحمٰن۔ درس سیرت: ۲۷

خدمت کی ہے۔(۱)

اس میں ہجرتِ حبشہ کی طرف اشارہ تھا، جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے حکم پر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور قریش مکہ کے لالچ دینے، خوشامد کرنے اور سیاسی، سفارتی دباؤ ڈالنے کے باوجود شاہ حبش نجاشی نے نہ صرف انہیں قریش مکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا، بل کہ انہیں رہائش وغیرہ کی بھرپور سہولتیں دے کر انہیں اپنے مہمان کی حیثیت سے اپنے ہاں ٹھہرایا تھا۔

اسی طرح حضرت خباب رضی اللہ عنہ ایک معروف صحابی ہیں، انہیں ایک بار آپ ﷺ نے کسی مہم کے سلسلے میں روانہ کیا، ان کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور نہ ان کے گھر کی خواتین کو دودھ دوھنا آتا تھا، اس لیے جب تک وہ واپس نہیں لوٹے، اس وقت تک آپ ﷺ پابندی سے ان کے ہاں جاتے اور دودھ نکالا کرتے تھے۔(۲)

خوش گمانی پیدا کیجیے

ہمارا گھر ہو یا دفتر یہ بدگمانی اجڑتا اور اعتماد و خوش گمانی سے پروان چڑھتا ہے۔ اعتماد بھی اچھے گمان سے ہوسکتا ہے، بدگمانی کے ماحول میں کسی پر اعتماد کیسے کیا جاسکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہمارے ماحول کی خرابی، ہمارے کاروبار کی تباہی اور ہماری خانگی زندگی کے اجڑنے کا بڑا سبب ہر جانب سے شک اور شبہ کی فضا اور عدم اعتماد ہے، جو بدگمانی کی پیداوار ہے۔ ہر ایک مقام پر ہمارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ کھوج کھوج کر برائیاں تلاش کی جائیں، تلاش کر کر کے منفی پہلو اجاگر کیے جائیں، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریکیوں کو عام کیا جائے۔

حال آں کہ جب تاریکی بڑھے گی تو روشنی خود بہ خود کم ہونے لگے گی اور اندھیرا چاہے کوئی کرے، کسی کا بھی اس میں ہاتھ ہو، مگر اس کا شکار سب مل کر ہوں گے، پھیلنے والے اندھیرے کو برداشت سب ہی کو کرنا ہوگا اور اس کے نقصانات سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کے برعکس اگر ہر ایک اپنے حصے کی روشنی پھیلانا شروع کر دے تو تاریکی کے بادل خود بہ خود

۱۔ شرح زرقانی۔ شرح الزرقانی علی اللمواہب

۲۔ ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ: ترجمہ خباب

چھٹنا شروع ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں روشنی زیادہ قوت سے پھیلنا شروع ہو جائے گی، جس سے سب ہی فائدہ اٹھائیں گے، اپنی اپنی قسمت کے مطابق۔

بدگمانی سے بچنے کا حکم ہمیں قرآن بھی دیتا ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم میں ارشاد مبارک ہے:

وَلَا تَجَسَّسُوْا (۱)

تجسس میں مت پڑو۔

جب کہ ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم معمولی معمولی باتوں میں بھی بدگمانی کا مظاہرہ کر کے اس خدائی حکم کی مخالفت کا باعث بن رہے ہیں اور اپنے ہی لیے تاریکیوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ وہ دین جسے دین رحمت کہا گیا، جسے انسانیت کے لیے روشنیوں کا ضامن بنا دیا گیا، اور جس نے تاریکیوں کو باقاعدہ ہدف بنا کر ختم کرنا شروع کیا، آج اسی کے نام لیوا طرح طرح کی تاریکیاں پیدا کر رہے ہیں اور اندھیریوں کو دور کرنے کی بہ جائے ظلمات میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں، بدگمانی بھی ان ہی تاریکیوں میں سے ایک ہے۔

بدگمانی ایک بد اخلاقی تو ہے ہی، یہ ایک نفسیاتی عارضہ بھی بن سکتی ہے اور ہم اگر خالص دنیاوی عینک استعمال کرتے ہوئے کاروباری نقطہ نظر سے بھی دیکھیں تو بدگمانی کی کیفیت اچھے بھلے کاروبار کو ناکام کر دینے کے لیے کافی ہے۔

جب انسان ہر بات کو منفی پہلو سے دیکھنا اور ہر چیز کے بارے میں منفی انداز سے سوچنا شروع کر دے تو مثبت پہلو خود بہ خود اس کی نظروں سے غائب اور منفی پہلو اپنے آپ اس کے سامنے روشن ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں اسے اچھائیاں نظر ہی نہیں آتیں اور برائیاں ہر سمت سے حملہ آور ہوتی دکھائی دیتی ہیں، اس وقت ایک عام اخلاقی برائی شدت کو پہنچ جاتی ہے اور ایک نفسیاتی عارضے کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر اس کا چھوڑنا مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس برائی کی ایک قباحت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے ساتھ اپنی ہی جیسی کئی ایک سنگین برائیاں بھی ساتھ متعارف کراتی ہے، جن میں کینہ پروری اور دوغلہ پن سرفہرست ہیں۔ بدگمان شخص

۱۔ الحجرات: ۱۲

کینہ پرور بھی لازماً ہوگا اور منافق بھی، وہ نہ تو اپنی رائے کا کھل کر اظہار کر سکے گا نہ اپنے دل کی کیفیت کو بیان کر سکے گا، یہ وصف کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ اور اس کی قباحتیں اور نقصانات ہر ایک کے سامنے واضح ہیں۔

اسلام صاف صاف یہ درس دیتا ہے کہ ظاہر کو دیکھو اور اس پر اعتماد کرو پھر اگر کہیں سے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرو اور اس برائی کو عام مت کرو، سوائے اس صورت کے جب عام لوگوں کو بھی اس سے دھوکہ اور ضرر پہنچنے کا یقینی خدشہ ہو، اور ہر شخص کے دل کا حال اس کے خدا پر چھوڑ دو، وہی عالم الغیوب ہے، وہی سب کے دلوں کی اندرونی کیفیتوں سے مکمل طور پر واقف ہے، اور آل کار ہم سب کو اس کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

اعراض کیجیے

الجھنا کسی سلجھی ہوئی طبیعت کا مزاج نہیں، مگر بعض اوقات انسان سے یہ کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔ اصل بات تو یہی ہے کہ انسان ہر طرح کے الجھاؤ سے اپنا دامن محفوظ رکھے۔ پھر بھی اگر ایسی صورت پیش آجائے تو درگزر سے کام لے اور اعراض کی کوشش کرلے۔ اعراض کا مطلب ہوتا ہے غیر ضروری چیزوں کو نظر انداز کرنا۔ انسان کا ذہن واضح ہو کہ اسے کیا کام کرنا ہے، اور کن کن امور سے بچنا ہے تو اعراض کے معنی اور مفہوم سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

انسان کسی بھی میدان میں غیر ضروری باتوں میں اس وقت الجھتا ہے جب اس کا ذہن اپنے کام کے سلسلے میں واضح نہ ہو، اور اس کی سوچ کسی خاص نکتے پر مرتکز نہ ہو، ورنہ صبح شام ایسے واقعات تواتر سے پیش آتے رہتے ہیں، جو انسان کا سفر کھوٹا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مگر انسان ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہ اسی لیے ممکن ہوتا ہے کہ انسان کی نظر اپنی منزل پر ہوتی ہے۔

دفتری اور انتظامی امور میں ایسے درجنوں معاملات پیش آتے ہیں کہ انسان کی توجہ چند لمحوں کے لیے اپنی جانب مبذول کرا لیتے ہیں۔ مگر انسان اپنی قوتِ ارادی سے اپنے کام کی جانب واپس لوٹ آتا ہے۔ یہی کامیابی ہے۔ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعوت

اسلام کا آغاز فرمایا تو آپ کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ آپ ﷺ کا پیغام پوری انسانیت کے لیے زندگی بخش اور حیات نو کی نوید تھا۔ لیکن وہ اتنا عظیم الشان اور اس دور میں مروج رسوم و روایات سے اس قدر ہٹ کر تھا کہ عوام کی اکثریت اس کی حقانیت کو فوری طور پر سمجھ ہی نہ سکی، پھر دوسرے کئی ایک عوامل بھی موجود تھے جو ان کے دعوت اسلام کو قبول کرنے میں مانع ہوئے، اس بنا پر آپ ﷺ کی مخالفت پر پوری تحریک برپا ہوگئی۔ یہ حالات ایسے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے کار کو بہ یک وقت کئی محاذوں پر کام کرنا پڑا، لیکن آپ ﷺ کی اصل دل چسپی کا محور یہی ایک پیغام رہا:

قولوا لا الہ اللہ تفلحوا

کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کام یاب ہو جاؤ گے۔

بعض موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفاعی اقدامات پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ اپنی بقا کی جدوجہد بھی کرنی پڑی، لیکن آپ ﷺ کی اصل توجہ کار نبوت پر ہی مرتکز رہی، اس بات میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں بھی ہمارے لیے ایک جہانِ عبرت اور درسِ حکمت پوشیدہ ہے۔

بنی مالک بن کنانہ کے ایک شخص سے امام احمدؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سوق ذی المجاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ ﷺ یہ فرما رہے تھے:

یا ایھا الناس، قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا

اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہ دو، کام یاب ہو جاؤ گے۔

راوی کہتے ہیں کہ ابو جہل بھی آپ کے ساتھ ساتھ تھا، وہ آپ ﷺ پر مٹی پھینکتا جاتا تھا، اور یہ کہتا جاتا تھا:

لوگو! یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کر دے، اس کی تو خواہش (اور کوشش) یہ ہے کہ تم اپنے معبودوں کو چھوڑ دو، اور لات و عزیٰ (کی پرستش) کو ترک کر دو۔

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جانب توجہ ہی نہ فرماتے تھے۔(۱)

یہ واقعہ سیرت طیبہ کا ایک اہم واقعہ ہے، مگر آج کی نشست میں ہماری دل چسپی کا باعث راوی کا یہ جملہ ہے،

ومایلتفت الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (ابوجہل) کی جانب توجہ ہی نہ فرماتے تھے۔

کس قدر تکلیف دہ جملہ ہے؟ مگر اس کے باوجود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے نظرانداز کر کے اپنے کام پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔

جذبات پر گرفت

غصہ فطرت ہے، انسان کو اشتعال آ ہی جاتا ہے، پھر انتظامی مناصب مناسب سختی کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ انسانی مزاج کا صرف ایک رخ ہے۔ ضرورت کے وقت اس کا اظہار خرابی کا باعث بھی نہیں بنتا، مگر اسے مزاج کی شناخت بنالینا مسائل کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا حل اپنے جذبات پر گرفت ہے۔ اس لیے انسان مزاج کی اصل شناخت نرمی، رحم وترحم، عفوودرگزر ہے۔

عفوودرگزر کی صفات ایسی مطلوب صفات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مومنوں کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس صفت کو اپنا کر عفواور درگزر کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲ (۲)

ان کو چاہیے کہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔

غصے کے اظہار کی اگر اجازت بھی دی گئی تو بھی چند اہم اور کڑی شرائط لازم کردی گئی

۱۔ احمد: ج ۱، ص ۱۰۸

۲۔ النور: ۲۲

ہیں۔ان شرائط کا خیال رکھنا انتظامی طور پر بھی ضروری ہے۔مثلاً ہر شخص صرف اُپنے معاملات کا مکلف ہے، دوسرے ان حضرات کا جو کسی بھی درجے میں اس کے ماتحت ہیں، یا اس کی نگرانی میں دیے گئے ہیں، دوسروں کی حدود کار میں مداخلت کسی بھی عنوان کے تحت نہیں کی جاسکتی، اس کے لیے دوسرا طریقۂ کار ہے، وہ ہے مناسب انداز میں، مناسب وقت پر سمجھانا اور اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنی راہیں الگ کر لینا۔

درحقیقت غصے کے اظہار کے حوالے سے انسانی کیفیات میں بڑا فرق ہے اور اس میں لوگوں کے نرم وگرم سنجیدہ وجلد باز اور پاکیزہ وبدکردار ہونے میں ان کی اصل فطرت اور ان کے طبعی مزاج کا بڑا دخل ہے، اس کے ساتھ ساتھ انسان کی اپنی خود اعتمادی اور مزاج کی استقامت بھی اس معاملے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، صحیح معنیٰ میں بڑا آدمی جس قدر اخلاق و کمال سے آراستہ ہوگا، اسی قدر اس کا قلب کشادگی کا حامل اور اس کا دامن حلم و بردباری کے اعتبار سے وسعتیں رکھتا ہوگا، وہ لوگوں کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرے گا اور ان کی بے گناہی کا پرچار کرے گا اور ان کی جانب سے معذرت کرنے پر اسے قبول کرنے میں تامل نہیں کرے گا اور اگر کوئی اس کی نرم طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا تو اسے نادان بچہ تصور کر کے اس سے صرف نظر کرے گا۔(۱)

زید بن سنعہ رضی اللہ عنہ ایک معروف صحابی ہیں، ان کے اسلام لانے سے قبل کا واقعہ ہے، یہ لین دین کا کاروبار کرتے تھے، اس دور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، قرض کی ادائیگی کی مدت ابھی باقی تھی کہ انہوں نے آ کر تقاضا کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک کھینچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سست کہا اور کہنے لگا کہ عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی کرتے ہو۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصے سے بے تاب ہو گئے اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اے دشمن خدا! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟

لیکن اس قدر سخت موقع پر اور حضرت زید کی جانب سے مکمل اشتعال انگیزی کے باجود

۱۔درس سیرت: ص ۲۱۶

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل غصے نہیں ہوئے اور ایک یہودی کی گستاخی کو کمال تحمل اور حد درجے اطمینان کے ساتھ برداشت کیا اور انہیں کچھ کہنے کی بہ جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے تم سے یہ امید تھی کہ تم اسے سمجھاؤ گے تم نرمی سے تقاضا کرو اور مجھے کہتے کہ میں اس کا قرض ادا کردوں اور پھر ان سے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر کے انہیں بیس صاع کھجور زائد ادا کرو۔(۱)

اختتام

انتظامی ذمے داریاں انتظامی صلاحیتیں مانگتی ہیں اور یہ صلاحیتیں وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہونی چاہییں۔ ان صلاحیتوں کو بنانے سنوارنے اور پالش کرنے کے لیے جہاں جدید تجربات سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، وہیں نبیٔ اکرم ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اسوۂ حسنہ اور تعلیماتِ مقدسہ سے بھی ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ فرق یہ ہی کہ یہ تعلیمات وحی الٰہی سے مستنیر ہیں، اور انسانی تجربے کی ناپختگی اور غیر یقینی سے ہر طرح محفوظ۔ اس لیے ہمارے سامنے اس یقینی رہ نمائی کے ہوتے ہوئے اس سے استفادہ نہ کرنا کسی بڑی محرومی سے کم نہیں۔

۱۔ شبلی نعمانی۔ سیرت النبی: ج ۲، ص ۲۱۶